ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

# انتظار حسین کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ

*ڈاکٹر شمائلہ سلیمان

***ABSTRACT***

*Short Story is a brief fictional Prose narrative, purely westeren form of literature. This is concerned with a one or few aspects of life. The concise narrative's success depends on its complex peot and treatement of characters. The technique of writin is major weapon in this regard. In Urdu literatrue history, specially in fiction, the numbers of successfull/writers are limited. One of those is Intizar Hussain who modified the techniques of "Tale". By using modern techniques, he presents his culture and civilization. Symbols are main source to understand he Intizar's arts. He potrays his values and identity of eastern culture. His short stories mode is spoken rather than written. He tries to show the peak of the culture and subsequently its diaspord. In this article efforts have been made to explore the sub-continent's culture & values, in Intizar Hussain's short stories.*

***Key words:*** *Intizar, short story, Tehzib, Bakht Nasar*

افسانہ نگاری ہیرے سے مشابہ ہوتی ہے کہ اس کی پہلو داری میں سماجی تصویر، کرداروں کی نفسی کیفیت اور حیات کی گوناں گوں گتھیاں مستور ہوتی ہیں۔ مگر اس کی بُنت ایسی چابکدستی سے کی جاتی ہے کہ وہ فن پارہ میں ڈھل کر قاری کی حسِ جمالیات کی تسکین کا باعث بن کر دھیرے دھیرے اس پر اپنی پرتیں کھولتی ہے۔ تحیر کی بھول بھلیوں میں گم پڑھنے والے پر زمان و مکان کے اسرا کھولنے کا دعویٰ جو افسانہ کر لے بس وہی کامیاب ابلاغ کا دعویٰ دار کہلا سکتا ہے۔ فکری طور پر بلوغت کے مقام پر فائز فنکار کو ہی یہ دعویٰ زیبا ہے۔ سید محمد تقی نہ کہ رکھا ہے:

> "فکر اور تخلیق ہمیشہ قابل احترام سعی رہی ہے لیکن فکر بھی درجہ بندی کی متحمل ہوتی ہے۔ بعض فکر صف اول کی اور بعض نسبتاً کم اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔" (۱)

تخلیق میں درجہ بندی کی کسوٹی فن پارہ خود ہے۔ تنقید نگار اور شارح زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے رہیں مگر کسی عدنی تخلیق کو اعلیٰ نہیں بنا سکتے اور نہ اعلیٰ فن پارہ کسی بیساکھی کا محتاج ہوتا ہے۔ تخلیقی عظمت اور فکری اپج کا تعین وقت کرتا ہے۔ جو ادب ہر زمانے میں اپنا اثبات کرے اور ہر دور میں نئے مفاہیم کھولے وہی حیات کا ترجمان کہلانے کا مستحق ہے۔ یونانی، ہندوستانی، بابلی اور انگلستانی علم و حکمت سمیت بیسیوں زبانوں کے سینکڑوں لکھاری بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اوڈیسی، مہابھارت، شیکسپیئر کے ڈرامے آج بھی زندہ و جاوید ہیں۔ ہیگل، نطشے، مارکس، غزالی، بیکن، فرائڈ، روسو کے نظریات فی زمانہ کہنہ نہیں کہے جاسکتے۔ امراؤ لقیس، ورڈزورتھ، گوئٹے، غالب، اقبال کسی ایک قوم اور وقت کے شعراء نہیں تھے۔ الف لیلہ، کتھاسرت ساگر، جاتک کہانیاں، انیسویں صدی کے مغربی نمائندہ (روسی، فرانسیسی، امریکی، انگریزی وغیرہ) ناول و افسانے زمانی و مکانی قیود سے آزاد ہیں۔ بقول لارنس جب کسی کتاب کے معانی طے ہو جائیں تو وہ مر جاتی ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ بہت پرانی نہیں اور اُردو افسانوی ادب کی کہانی تو بہت ہی نوخیز ہے۔

---

*وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

انتظار حسین نے افسانے لکھنے کا آغاز اس وقت کیا جب اس میدان میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی جیسے فن کار موجود تھے۔ ان لکھنے والوں کی صف میں جگہ بنانا اور توجہ حاصل کر لینا ہی کامیابی کی دلیل تھی۔ ان کا پہلا افسانہ قیوما کی دوکان کی بازگشت دور دور تک سنی گئی۔ اپنی فنی اٹھان کو اُڑان بنانے میں انہیں بہت محنت درکار تھی کیونکہ اسی زمانے میں غلام عباس، اپندر ناتھ اشک اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ بھی بطور افسانہ نگار سامنے آ چکے تھے۔ انتظار حسین کے لیے آسانی البتہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے پیدا کر دی۔ توصیف و تعریف سے زیادہ بہتر چیز ادب میں ردِ عمل ہے۔ بقول انتظار حسین وہ جبر جو تخلیقی غیرت کو للکارے زیادہ اہم ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جو نعرہ بلند کیا اس کے سحر سے نئے لکھنے والوں کا باہر رہنا مشکل تھا۔ دوسرا ان کے خیال میں جو ان کا ہم خیال نہیں وہ گویا ادیب ہی نہیں یا اگر ادیب ہے تو اس کا فن کارِ بے بنیاد ہے۔ انتظار حسین کو نانی اماں کی کہانیاں لکھنے والا، کہانی کو افسانہ نہ ماننے کی رٹ، ناسٹلجیا کے طعنے وغیرہ در حقیقت انتظار حسین کے لیے چیلنج تھا جس کو انہوں نے خوشدلی سے قبول کیا۔

انتظار کا اسلوب ان کی اپنی اختراع ہے جو انہوں نے روایت و جدت کے امتزاج سے کشید کیا ہے۔ وہ کردار سے کم اور فضا سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں فطری عناصر بھی کرداروں کے ہم پلہ کردار نظر آتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے تخیل اور فکر کو زمین سے باندھ رکھتے ہیں۔ وہ حافظے کو گم نہیں ہونے دیتے۔ ماضی کھو جائے تو انسان مکمل ہوتے ہوئے بھی ادھورا رہتا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانے لاشعور (unconscious) کو سونے نہیں دیتے۔ الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) کے جواب میں قالو بلیٰ (بے شک تو ہی ہمارا رب ہے) والے جواب سے شروع ہونے والی زندگی، ماں کے پیٹ والے چند ماہ ابتدائی دو ڈھائی سال جس طرح شعور کی گرفت سے باہر ہیں مگر ہیں، جو لاشعور کی آنچ سے حدت پاسکتے ہیں۔ بعینہ انسان اپنی اجتماعی تاریخ و تہذیب سے بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ قیوما کی دکان سے لے کر تادم آخر انتظار حسین کا فنی نقطہ نظر سر مو اِدھر اُدھر نہیں ہوا۔ انگریزوں کے ہندوستان میں داخلے کے وقت کو انتظار نے روحانی بکھراؤ کے طور پر لیا ہے۔ ان کو تقسیم کی واردات نے سامراجیت کو سمجھنے میں مدد دی۔ وہ افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی میر انیس، نظیر اکبر آبادی اور مولانا محمد حسین آزاد سے متاثر ہیں۔ انیس کے پاس مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ بطور محرک موجود تھا۔ نظیر نے ارضی رشتے کو انسان کی رفعتوں کا ذریعہ جانا اور آزاد کی انفرادیت ان کا طرز احساس ہے جو تاریخ و تہذیب کے بارے میں تھا۔ یہ خالی بیان نہیں تھا بلکہ انتظار حسین کے فنی سفر میں ان تینوں شخصیات کے اثرات نمایاں ہیں۔ تخلیقی عمل میں محرک کی کارفرمائی لازم ہے۔ یہ محرک کوئی چھوٹا سا واقعہ، یاد بھی ہو سکتے ہیں اور کوئی بڑا سانحہ بھی۔ مثلاً محمد عمر میمن کو انٹرویو دیتے کہتے ہیں کہ کسی روز خواب میں مجھے یکایک اپنی بستی نظر آجاتی ہے۔ صبح پریشانی کے عالم میں اپنے آپ کو پاتا ہوں وہی پریشانی رفتہ رفتہ کسی افسانے کا نقطہء آغاز بن جاتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ساون کا موسم آتا ہے اور میں یہاں بارشیں دیکھتے دیکھتے یکایک اپنے کان میں اس کوئل کی آواز سننے لگتا ہوں جو ڈبائی کے کسی باغ میں بولا کرتی تھی۔ (۲)

سانحہ مشرقی پاکستان پر افسانہ "شہر افسوس" جیسی مثالیں بھی موجود ہیں۔ میر انیس کو ان کے افسانوں میں ڈھونڈنا ہو تو جہاں بھی کربلا آئے سمجھ لیں وہ ان کا اثر ہے۔ کربلا شاید ہی کسی فکشن نگار نے اس تواتر کے ساتھ استعمال کیا ہو جتنا انتظار نے برتا۔ انیس نے اس واقعہ کو پیش منظر میں رکھ کر ہندوستان کی تہذیبی روایت کی ریخت کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔ انتظار حسین نے کربلا کو تخلیقی تجربے میں لا کر نیا افق ڈھونڈا اور شاید یہیں سے وہ بائیبل کی طرف متوجہ ئے۔ جہاں بنی اسرائیل کے کتنے ہی واقعات کربلا سے مشابہہ نظر آتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

"بخت نصر نے یروشلم کو برباد کیا۔ وہ بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے بابل لے گیا، جہاں وہ پچاس سال تک مصیبتیں جھیلتے رہے۔ ان کی زبان پر یہ گیت رہتے؛ ہم بابل کے دریاؤں کے کنارے بیٹھ کر صہیون کو یاد کرتے اور روتے ہیں۔"(۳)

افسانوں میں دردمندی اور احساس ندامت کی شدت (intensity) کو ظاہر کرنے کے لیے اس طرح کے تجربات اُردو فکشن کو وقیع بناتے ہیں۔ انیس اور انتظار کے اس رشتے کے متعلق گوپی چند لکھتے ہیں:

"فکشن میں قراۃالعین حیدر اور انتظار حسین کے فن کو اس وقت تک سمجھا ہی نہیں جا سکتا جب تک اس تخلیقی سائیکی کو نظر میں نہ رکھا جائے جو راویت میں تہ نشین تو تھی لیکن جس کی دردمندی کو ادب کی آفاقی دردمندی کی دولت انیس نے دی اور اسے ادبی تخلیقی روایت کا زندہ دھڑکتا ہوا حصہ بنا دیا۔"(۴)

سقوطِ دلی اور تقسیم ہند کو ادب میں موضوع بنایا گیا تو افسانوی ادب میں اِن کو سطحی انداز میں لیا گیا۔ اردو افسانے کی حد تک موخر الذکر ہی زیر بحث آیا۔ یہ وہ دور ہے جب اُردو افسانہ اپنے کلاسیکی دور میں تھا۔ مگر ان فنکاروں کی اکثریت نے تقسیم کو ایک حادثہ سمجھا۔ سامراج کی سازش، سیاسی تقسیم، اخلاقی زوال کے تناظرات ہی کہانیوں میں ابھرے۔ متنتیات کو چھوڑ کر اس تہذیبی بکھراؤ کو گویا سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ انتظار حسین نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور تخلیق کو نیا موڑ دیا۔

روحانی انحطاط اور اخلاقی زوال کو عموماً انہوں نے انفرادی اور معاشرتی سطح پر اثر انداز ہوتے دکھایا ہے۔ ایسے میں سماج نصیحتوں پر کان نہیں دھرتے اور ناصح مایوسی کا شکار ہو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ الفاظ اپنے معنی کھو دیں تو وہ بے کار ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی مجموعہ کے افسانوں میں زمین اور انسان کے رشتوں کو جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہجرت کے تجربے کو عام انسان کی وساطت سے بیان کیا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کے فن میں پختگی آئی اور انہوں نے بنیادی وجوہات (Root Causes) تلاش کرنے کی سعی کی جو تہذیبی بکھراؤ کا سبب بنیں۔ انسان نیکی اور بدی کی جنگ ازل سے لڑ رہا ہے اور تاریخ سے یہ ثابت شدہ امر ہے کہ بدی کا پلڑا بھاری چلا آرہا ہے۔ اتنا بھاری کہ بدی اور نیکی گڈمڈ بھی ہوئے اور کئی مرتبہ بدی اور نیکی اپنے مقام ادل بدل کر بیٹھیں۔

نفس پرستی، مادیت اور تنگ نظری قدیم ہندوستانی کلچر کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئے۔ انہوں نے نوآبادیاتی نظام کی آمد کو برائیوں کا آغاز قرار دیا ہے۔ یہاں کے باسیوں کا اپنی زمین کے ساتھ رشتہ کیا تھا؟ اور بعد میں اس رشتے کی نوعیت کیا ہو گئی؟ یہ سوال انتظار حسین نے شدت سے اٹھایا ہے۔ افسانے کا مُدعا معاشرتی مظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن میں جھانکنا اس واسطے مناسب سمجھا ہے کہ حاضر حقائق کی حقیقت بجا مگر غائب کی دنیا کا وجود بھی سچ ہے۔ تخلیقی چیلنج یہی بنا کہ اس تعلق کو ثابت کیا جائے۔ انسانی افکار اور حوادث کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ تاریخ یہ ہے کالنگ وڈ کا کہنا ہے۔(۵)

انتظار حسین نے اسی لیے تاریخ سے مدد لی ہے۔ مٹی سے انسانی رشتے کی نوعیت کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے تاریخ کے بڑے واقعات کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً ہجرت کو ہجرتِ مدینہ، ہجرتِ کوفہ و کربلا، بنی اسرائیل کی ہجرت، طوفانِ نوح کے نتیجے میں ہجرت، پانڈوں کا بن باس وغیرہ سے جوڑا۔ اسلوبیاتی تجربے کے لیے مسالہ قدیم ہندی لٹریچر میں وافر مقدار میں تھا۔ اردو ادب کو اس سے آشنائی کا سہرہ انتظار حسین اور قراۃالعین حیدر کے سر بندھتا ہے:

"کہانیوں اور قصوں میں تو ہندوستان بہت ہی بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ کہا جا سکتا ہے ک کل تاریخی اور مذہبی لٹریچر انہیں قصوں اور حکایتوں سے بھرا ہوا ہے۔"(۶)

روایت کے اس خزانے میں سے انتظار حسین نے اپنے حُصّے سے زیادہ حصہ پایا۔ روایت اور جدت میں جو بعد تھا اس کو نہ صرف پاٹا بلکہ ان دونوں کے گھال میل سے ایک نئی راہ افسانوی ادب کے لیے نکالی۔ جدت سائنسی اصولوں پر کاربند تھی اور ٹھوس چیز کو حقیقت مانتی تھی مثلاً درخت ہے تو اس کو فقط درخت ہی مانا جائے گا۔ اس کے اوپر یا نیچے کوئی چیز ماورائی مخلوق رہائش پذیر ہے تو موضوع بحث نہیں بن سکتی۔ مگر انتظار درخت کو ماوراء کے بغیر نامکمل سمجھتے تھے۔ یہ نقطہ نظر قصہ کہانیوں اور حکایت کے قریب تھا۔ یہ ادبی تصور بنیادی طور پر انسان کی نفسیات کو جاننے کے لیے سامنے آیا۔ انتظار صاحب کے کل جہان فنِ کے پیچھے تہذیب، تاریخ اور ہجرت کا تجربہ ہے۔ مہذب آدمی زمانے بیت جانے کے بعد بھی تقدیر کے ہاتھوں کھلونا ہے۔ اس بھید کو افسانے کی مدد سے سمجھا گیا۔ قتل و غارت صرف واقعات نہ تھے بلکہ المیہ تھے۔ ہجرت فقط نقل مکانی نہ تھی بلکہ یہ روایات کا تسلسل تھا۔ مہا بھارت اور مسلم ہجرت کے کینوس پر اس کو رکھ کر وسیع تر مفہوم دینے کی سعی کی گئی۔ تمام تر تاریخ بنانے اور تہذیب بگاڑنے میں انسان مرکزی کردار ہے۔ تو کیوں نہ پھر انسان کی ذات پر بات کی جائے جو افعال وہ سر انجام دے رہا ہے جس طرح کے اس کے اقوال ہیں کیا وہی سب کچھ ہے یا کچھ اور بھی ہے، جو نظر نہیں آتا مگر ظاہر پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی سانحہ ہو کہ واقعہ، اس کے تمام تناظرات کو جب تک سامنے نہیں رکھا جاتا اس کے اسباب و علل کا تجزیہ نہیں ہو جاتا، اس وقت تک حتمی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ ہجرت ایک واقعہ ہے اور تقسیم کو نظری صُلح کاری کے ذریعے مبہم بنایا جائے۔ تو گویا وہ انسان کو مکمل جاننا چاہتے ہیں۔ آصف فرضی کا کہنا ہے کہ انتظار حسین اپنے آپ سے آگے کا سوچتے ہیں اور ان کا افسانہ اس سلسلے میں ان کا ناصر ہے۔ تعقل کے دوسرے طریقے نہیں وہ سقراط کے ایماء پر عقل و خرد کی اس راہ پر چل پڑے ہیں جو جدید ادب تک پہنچی ہے کیونکہ عقل اس بغیر عقیدے کی وہ سہولت حامل نہیں رہی جو قدیم انسان کو حاصل تھی۔(۷)

خود آگہی کو خدا آگاہی کی ہمسری حاصل ہے لہذا اس کے بعد پھر آدمی کی اصلیت تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا" مجموعہ آخری آدمی "میں شامل افسانہ "پرچھائیں" میں سرورِ کونینؐ اور ان کے اُمتی کا تقابل دیا گیا ہے۔ "وہ جسم جو پر چھائیں سے ماوراء تھا اور اپنا بدن جو محض پر چھائیں ہے اور جس پر مکھیوں کا بسیرا ہے اور جس پر کوئی بادل سایہ نہیں کرتا ہم کس جسم کی پر چھائیں ہیں۔" (۸)

اور ہم کیوں موجودہ حالت پر پہنچے یہ سوالات ہیں جن کے جوابات تلاش کیے جانے چاہیں تاکہ ہمیں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو سکے۔ جو جسم مکھیوں کی آماجگاہ ہو اس کی روح کیسے مصفا ہو گی۔ اس پر جب غور و خوض ہو تو قامت کی درازی کا راز کھلے۔ انتظار حسین کی ہنر مندی یہ ہے کہ ان کی کہانی کا کہانی پن برقرار رہتا ہے۔ حالانکہ اخلاقی پند و نصائح کہانی میں ثقالت پیدا کر دیتے ہیں۔ بیسویں صدی کو عموماً تباہیوں اور بربادیوں کے حوالے سے جانا جاتا ہے مگر اس صدی کو نعروں تقریروں اور خطیبوں اور مداریوں کی صدی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے اثرات براہ راست انسان کی ذات پر پڑے جو بعد میں اجتماعی سوچ کی صورت ابھرے۔ جوشِ خطابت اور نعروں کے شور نے اذہان کو ماؤف کر دیا۔ عقل و خرد کی بجائے جوش و جنون کا ڈنکا بجنے لگا۔ تعصب کی وہ آگ بھڑکائی گئی کہ انسان انسانیت کے مقام سے ناآشنا ہو گیا۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے خرد کی قوتوں کو تحریک دینے کی سعی کی ہے۔ خارج کے توسل سے باطن کا کھوج لگایا گیا ہے۔ خارج کی دنیا محدود ہے پوری حقیقت کا ادراک باطنی کیفیات سے ہی ممکن ہے۔ روح کا مطالعہ بغیر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

گیان کے ممکن نہیں۔ تاریخ کا دھارا جس نہج پر بیسویں صدی کے نصف آخر میں چلا اس سے یہ ثابت ہوا کہ آدمی نعروں کے سحر میں فریب کو حقیقت سمجھ بیٹھا۔ وہ زینہ تو طے کر رہا ہے مگر وہ بلندی کی بجائے اندھیرے کنویں کی سیڑھیاں اترتا چلا جاتا ہے۔

"آدمی .....؟ لومار شی نے حقارت سے کہا، آدمی تو مورکھ ہے، اسے اپنے چھل کھپٹ، اپنے لڑنے مرنے سے فرصت نہیں۔ اسے کیا گیان ملے گا۔ اور وہ کسی کو کیا گیان دے گا۔" (۹)

برصغیر کی سماجی اور سیاسی تاریخ کو محض خارجی سطح پر پرکھا جاتا رہا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی روح میں جھانک کر پتہ کیا جائے کہ حالات کے جبر کا فلسفہ کیا ہے۔ انتظار حسین نے افسانے میں اس گتھی کی گرہیں اپنے کرداروں کے وسیلے سے کھولی ہیں۔ "رہ شوقِ منزل مقصود" ان کے اولین مجموعہ کی چھٹی کہانی ہے اس میں محلہ کی عام خواتین آزادی پر بحث کر رہی ہیں۔ نو آبادیات اور مابعد کی صورتحال کا تقابل ہو رہا ہے۔ اماں جی نے فرنگی کے زمانے کو آئیڈیل قرار دیا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے یہ ساری افراتفری مسلم لیگ اور کانگرس کی وجہ سے ہے۔ مشن کی امی نے آزادی کو نعمت کہا کہ اس کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے یہاں اماں جی کا ردِ عمل یوں ہے:

"اب وہ ہمارا نیم والا گھر تھا نا۔ اس میں اشرفیوں کی دیگ تھی، رات کو ایسی چھن چھن بولتی چلی جاتی تھی بس یہی آواز آتی تھی کہ بیٹا دے دے دولت لے لے بیٹا دے دے دولت لے لے۔" (۱۰)

جس طرح انتظار حسین اُردو زبان سیکھنے میں جوش صاحب کی بجائے نانی اماں کی کرامت کے قائل ہیں بالکل اسی طرح تاریخی و تہذیبی شعور سیکھنے اور سکھانے کے لیے دانشوروں کی بجائے وہ ان پڑھ بڑی بوڑھیوں کی لیاقت کے قائل ہیں۔ والٹیر نے جو کہا تھا کہ تاریخ سچائی نہیں بلکہ ایسی کہانی ہے جس پر لوگ متفق ہو گئے۔ (۱۱) یہ ان پڑھ تاریخ سے ناپلد زمینی حقائق اور ارضی حقیقتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

انتظار حسین کا پورا فن تاریخ کے ہر جھوٹ کا پردہ فاش کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا نظر آتا ہے۔ تاریخ نے جس طرح معاشرے کی چولیں ہلانے کی توجیح پیش کی وہ محض فریبِ شعور ہے۔

انتظار حسین کے لیے ہجرت ایک تجربہ تھی۔ ایسا تجربہ جس کی روایت ہجری کیلنڈر سے جڑ جاتی ہے۔ اور شاید تاریخ نے بھی لوگوں کو خواب کی اسی تعبیر پر متفق کر دیا۔ اانتظار حسین نے جب دیکھا کہ قوم اس تجربے کو نہ صرف ضائع کر بیٹھی ہے بلکہ خود اپنی تاریخ بھی گم کر دی ہے۔ (۱۲) تو وہ قوم کو بھولی ہوئی تاریخ یاد کروانے پر کمربستہ ہو گئے۔ 1857ء سے 1971ء تک تاریخ کے ہر بڑے واقعے نے انہیں یقین دلوایا کہ سفر تنزلی کا ہے جوڑ کنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ مسلمانوں کی تاریخ اور برصغیر کی تاریخ میں جو مماثلتیں ہیں ان میں ایک مشترکہ نکتہ تعصب ہے۔ عصبیت بنیادی طور پر ملوکیت کا ہتھیار رہا ہے جو جاہلیت کی نشانی تھا۔ سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو آلہ کار منتخب کیا گیا۔ جس نے سماج کو منافرت کی راہ پر ڈالا۔ خود پسندی اور دوسروں کو راندۂ درگاہ قرار دینا سامی مذاہب کی روایت ہے۔ مسلمان بھی اس سے مبرا نہیں۔ یہ رویہ بالواسطہ تعصب کو راہ دیتا ہے۔ اس سے مگر سب سے بڑی قباحت شخصی عدم توازن ہے۔ کلمہ پڑھ کے عمل کے بغیر جنت کے خواب دیکھنا اور دکھانا بری بات نہیں مگر زمینی حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لینا المیہ ہے۔ یہ طرزِ عمل افسانہ نگار نے جا بجا دکھایا۔ جس طرح وہ خود الف لیلہٰ اور کتھاسرت ساگر کو برابر بڑی طاقتیں مانتے ہیں۔ (۱۳) اور ان سے برابر استفادہ بھی کرتے ہیں اسی طرح وہ ہندوستانیوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کربلا اور کاشی کی ایک جیسی تعظیم کریں۔ اس خواہش کے پیچھے تہذیبی نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا کہ جسمانی طور پر مکین کہیں رہا جائے اور روحانی ڈوریاں وہاں نہ ہوں۔ یہ زمین سے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

کمزور جڑت کی نشانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نازک وقت پڑنے پر نہ ہاتھ میں باگ تھی اور نہ پاؤں رکاب میں تھے۔ نظریات وافکار کی یہ چکا چوند مغربی سامراج نے اٹھارویں صدی میں متعارف کروائی۔ پرانی تہذیب و اقدار کو دقیانوسیت قرار دیا گیا اور جدید یت کو ترقی کی معراج۔ انتظار حسین نے مہذب اور غیر مہذب کے فرق پر سوال اٹھایا ہے۔ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ انسان اور ان پڑھ کسان کا تقابل کر کے کچھ پوچھا ہے:

"تعلیم یافتہ وہ سند یافتہ نوجوان ہے۔ جس نے جیمز جینز کا جملہ تصانیف پڑھی ہیں مگر آسمان پر کھلے ہوئے تاروں کو دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ مشتری کون سا ستارہ ہے۔ یا تعلیم یافتہ وہ ان پڑھ دہقان ہے جو تاروں کو دیکھ کر یہ بتا سکتا ہے کتنی رات گئی ہے۔"(۱۴)

برصغیر کی تاریخ جو بدلی گئی یا بنائی گئی اس میں نئی روشنی والے پیش پیش تھے اور اس کا کریڈٹ بھی انہوں نے بہانگِ دہل لیا۔ مگر اس کی قیمت دہقانوں اور مزدوروں نے چکائی اور آج بھی چکا رہے ہیں۔ انتظار صاحب کے افسانوی کردار اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کنکری میں شامل ایک افسانے "مجمع" میں مرکزی کردار پنن ہے جو غریب لڑکا ہے۔ وہ جلسہ میں مقرر کی تقریر سن رہا ہے۔ سامراجی ممالک، غاشیہ بردرا، حاشیہ نشین، فسطائیت پسند، سرخ سویرا، ماوزے تنگ، دھرتی کی کوک سے جنم لیتا نیا انسان، جاگتا ہوا ایشیاء، امت اور اشتراکیت۔ ویانا کی امن کانگریس میں پانچ ہزار پانچ سو فاختائیں اڑائی گئیں۔ ساری تقریر پنن کے سر سے گزر گئی:-

"فاختہ اڑانے کے جملے پر پنن کے کان کھڑے ہوئے۔ ساری تقریر میں یہی ایک فقرہ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ اب تک وہ ہونق بنا بیٹھا تھا۔۔ ہیولٹ جانسن، پیلونز دوا، لوئی اراگوں، ماوزے تنگ، مارشل اسٹالن۔۔۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا الہٰ دین کی کہانی والا افریقی جادوگر پھر زندہ ہو گیا ہے۔ اور ان طلسماتی ناموں اور لفظوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی تڑاخ سے زمیں پھٹے گی اور پڑاخ سے وہ اس میں جا پڑے گا۔ اس کے بالکل پیچھے نوا قلی بھی بیٹھا تھا جسے کئی مرتبہ زور زور سے نعرے بھی لگاتے دیکھا تو پنن کو اسکی علمیت اور قابلیت کا لوہا ماننا ہی پڑا۔"(۱۵)

مقرر جدید تعلیم یافتہ ہے اس کی فکر کے دھارے دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے پھوٹ رہے ہیں۔ سامعین تاروں کو دیکھ کر رات کا پہر تو بتا سکتے ہیں مگر شاید وہ ستاروں کی چالوں سے ناواقف ہیں۔ یہ سارے بازی گر ہیں جو کھلا دھوکہ دینے پر قادر ہیں۔ نوا قلی اور پنن جیسے لاکھوں لوگوں نے پھر مشاہدہ کیا کہ زمین بھی پھٹی اور وہ زندہ در گور بھی ہوئے۔ مقررین اور عطائیوں کی کرامات نے علیحدہ تشخص پر زور دیا۔ ہندوؤں کے ساتھ بھوجن کھانے والے، مکمل طور پر انگریزی نظام کے پروردہ، عوام کو الگ تشخص کا سبق پڑھانے لگے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں یہ واضح نظر آتا ہے کہ اس طرزِ فکر نے سراسر گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ لیجسلیٹو اسمبلیوں میں چند اضافی سیٹس ہی اصل میں مدعا تھا جس کے لیے قوم کا مستقبل داؤ پر لگایا گیا۔ علیحدہ شناخت کے مطالبے کا نتیجہ کیا نکلا۔ فتح محمد ملک نے لکھا:

"سن انیس سو اڑتالیس میں لکھی گئی کہانی "قیوما کی دکان" میں بستی کی مسلمان شناخت نمایاں ہے۔ جبکہ پچاس برس بعد لکھی گئی کہانی "دائرہ" میں اس بستی کی مسلمان شناخت گم ہو چکی ہے اور کہانی کا واحد متکلم اس مسلمان شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔"(۱۶)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

خدا تو نہ ملا سونہ ملا صنم بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ انتظار حسین نے شناخت کو مرغے کی کلغی سے تشبیہ دی ہے۔ ہجرت کے تجربے سے افسانہ نگار نے یہ اخذ کیا ہے کہ سب لا حاصل رہا۔ انقلابی خود جیسے اُدھیڑ بن میں ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔ بعینہٖ افسانہ نگار اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ راستے گم ہو چکے ہیں، منزل سراب نکلی۔ راہرو بے اعتبار ٹھہرا۔ اپنی حالت گمراہ کی سی ہے۔ کالی رات میں گھنگور گھٹا میں بجلی کی چمک سے راستہ نظر آتا ہے تو راہی آگے بڑھتے ہیں۔ مگر یہ ساعت چند لمحوں پر مشتمل ہوتی ہے، تو پھر رُک جاتا ہے۔ افسانہ بھی اسی طرح کی صورت حال سے دوچار ہے۔

"جب میں افسانہ لکھنے بیٹھتا ہوں تو مجھے کچھ کچھ نظر آتا ہے۔ یہ پورا تجربہ جو ہے جس ہم اس وقت گزر رہے ہیں یہ اس کی کیا شکل ہے اور یہ ہمیں کس طرف لے جا رہا ہے اور جب یہ افسانہ مکمل ہو جاتا ہے تو پھر میں اندھرے میں آجاتا ہوں اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میرے ادر گرد کیا ہو رہا ہے۔"(۱۷)

افسانہ سماج اور معاشرت کا آئنیہ دار ہوتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوی کردار زیادہ تر مسلمان ہیں اور کہانیوں میں اجتماعی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم کے بعد جس صورت حال نے جنم لیا اس میں کہانی کار کا پورا سماج اندھیروں میں بھٹکتا دکھائی دیتا ہے۔ سمت کا تعین سرے سے کیا ہی نہیں گیا، سفر کے دوران آندھیوں نے آلیا۔ دور اندیشی کے فقدان کا ذمہ دار کون ہے، تہذیبی بکھراؤ کا گنہگار کون ہے، پھر سماج کے اندر مسلسل توڑ پھوڑ جو ہوتی چلی جا رہی ہے یہ کیوں ہے۔ یہ سوال گہرے تاریخی شعور کے متقاضی ہیں۔ انہی سوالات کو انتظار حسین کے افسانوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جنہوں نے مایوسوں سے قوم کو نکالنا تھا ان کی اپنی قابلیت سوالیہ نشان ہے۔ وہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے الٹا الجھانے میں لگے ہیں۔ شہر افسوس میں شامل افسانہ "دوسرا راستہ" کے کردار ذاتی شناخت نہیں رکھتے بلکہ ان کی شناخت علامتوں سے ظاہر کی گئی ہے مثلاً کتبے والا آدمی۔ بیگ والا شخص، اچکن والا، ثقہ آدمی، عینک والا وغیرہ یہ سب ایک ڈبل ڈیکر بس میں سوار ہیں جو غلط روٹ پر گامزن ہے۔ باہر ہنگامے ہیں اور پیدل چلنے والے لوگ بس پر پتھراؤ کر رہے ہیں۔ بیگ والا شخص ثقہ آدمی کو اپنا خواب سنا رہا ہے۔

"کارخانے میں ریشم ہی ریشم اور بندر۔۔۔۔۔ جیسے ہر بندر نے ریشم کی ایک گچھی لے رکھی ہے۔۔۔۔۔ یہ ریشم برباد کر رہے ہیں"(۱۸)

بندر کی علامت افسانہ نگار نے تواتر کے ساتھ اپنے فن میں استعمال کی ہے۔ اور اس کو مختلف مواقع پر مختلف مفہوم میں برتا ہے۔ یہاں بندر غیر مہذب اور تخریب پسند کے طور پر بیان ہوا ہے۔ ریشم اور بندر کا تعلق تو اُردو محاورے میں کسی بھی تعبیر کا محتاج نہیں۔ اس کہانی میں سیاسی معنویت ڈھکی چھپی نہیں۔ جنھوں نے گتھی کو سلجھانا ہے، وہی اگر الجھانے پر تل جائیں تو پھر نتیجہ کیا نکلے گا۔ اسی کہانی میں حضرت ابو ذر غفاریؓ اور عمر بن اعبد العزیزؒ کا تزکرہ بھی ہے۔ صدیاں گزر گئیں انصاف مانگتے انصاف نہیں ملا مجھے۔ اس خطے کے لوگ اس سماج کے لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ تاریخ نے ہمیشہ منصفوں کی طرف داری کی ہے۔ سائل اور مظلوم کو عدل دستیاب نہ ہوا۔ مظلوم ہمت باندھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ حالات کے ذمہ دار کو للکارے یا کم از کم اس کی نشاندہی کرے۔

"سمجھ میں نہیں آتا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ثقہ شخص آہستہ سے بولا "ہاں لوگوں کو ہی کہا جائے گا اور کس کو کیا کہا جائے؟ عینک والا آدمی غصے سے کانپنے لگا۔۔۔۔۔ دانتوں میں ہونٹ چبائے ہوئے بڑبڑایا: حرام زادے اور چپ ہو گیا۔" (۱۹)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

یہ لوگ کون ہیں جن کو مخاطب کیا جارہا ہے۔ جن پر غصے کا اظہار ہو رہا ہے۔ کیا یہ لوگ بے نام ہیں۔ گمنام ہیں یا ان کی کوئی شناخت بھی ہے۔ یہ قاری اور ناقد نے بتانا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کو منطقی انجام دلی میں پہنچایا گیا تھا۔ دِلی میں آزادی کے متوالوں کے داخلے سے قبل دلی کی جامع مسجد کی دیواروں پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا تھا کہ فلاں دن حملہ ہو گا۔ اور خون خرابہ ہو گا۔ المیہ ہے کہ تخریب کار سالوں سے نامعلوم چلا آرہا ہے۔ تو کیا ہم یہ سفر یوں ہی جاری رکھیں؟ فنکار تو اُمید کی کرن دکھاتا ہے وہ ہر حال میں بہتر مستقبل کی نوید سناتا ہے مگر انتظار حسین ایسا کچھ نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اس میں اصلاح احوال مشکل ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ لوگ رات کی طوالت کے خواہشمند ہیں۔ جو ادب ہر حال میں آخر میں صبح ضرور طلوع ہو گی، سویرا لازم ہے کا نعرہ لگاتا ہے وہ محض سراب ہے۔

"سورج ضرور طلوع" ہونے کا جو ٹکڑا ہے تو یہ مجھے بہت vulgar نظر آتا ہے۔(۲۰)

انتظار حسین نے انسانی دکھوں اور غموں کو کہانیوں میں بیان کیا ہے۔ مہابھارت، ٹرائے، عالمی جنگوں سمیت ہر لڑائی کا انجام ماؤں کے بینوں اور یتیموں کی سسکیاں ہوتا ہے۔ مذہبی، لسانی، نسلی اختلافات کی آڑ میں لڑائیاں دراصل کچھ لوگوں کا ایجنڈ ہے۔ یہ لوگ قابل نفرت ہیں جنگ سب ماؤں کو ایک طرح ستائی ہے۔(۲۱)

پھر تاریخ اس بات کی گواہ ہے یہ مائیں ازل سے اسی طرح روتی آرہی ہیں۔ عہد بہ عہد ظلم کی چکی میں پستے عوام دور جدید میں داخل ہونے کے باوجود اپنے مقدر کو بدل نہ سکے۔ دربدری کا سفر، مدینہ، کوفہ، بغداد، اصفہان، غرناطہ سے ہوتا جہان آباد تک پہنچا۔ پھر بھی رکا نہیں۔ ڈھاکہ کے سقوط نے تاریخ مغالطے کو سمجھنے میں مدد دینے کی بجائے اس کو مزید الجھا دیا۔ انتظار حسین کے افسانوی کردار جو علامتی شناخت کے حامل ہیں ان کے رِدعمل سے ہمیں بھی کچھ روشنی دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ کا وہ پوشیدہ پہلو جو عوام پر منکشف نہیں ہوتا اس کو علامت کے توسل سے واضح کہا گیا ہے کیونکہ بقول فتح محمد ملک اس تاریخ کے باطنی رخ کو حقیقت نگاری کی روایت میں منکشف نہیں کیا جاسکتا۔(۲۲)

ڈھاکہ ہمارے انداز فکر اور طرز عمل کو تبدیل نہ کر سکا۔ احساس زیاں کو محسوس کروانے کے لیے انتظار حسین نے وہ جو کھوئے گئے، شہر افسوس، اسیر، شور اور نیند جیسے افسانے تخلیق کئے۔ ان کہانیوں میں ہمارے نظریہ تاریخ و تہذیب پر سوال اٹھائے گئے ہیں۔ بودے اور من گھڑت تصورات کی عمر بہت قلیل ہوتی ہے۔ برصغیر میں مابعد نو آبادیاتی مطالعہ نے دوڈھائی دھائیوں میں ان کی قلعی کھول دی۔

"میں نے نوجوان سے پوچھا یہ تیری کون ہے۔ بولا کہ یہ میری بہن ہے۔ میں نے کہا کہ تو اسے برہنہ کر۔ یہ سنا تو لڑکی پر دہشت طاری ہو گئی۔ میں نے نیام سے تلوار نکالی، اس کے لرزتے ہاتھ بہن کی ساڑھی کی طرف بڑھے۔"(۲۳)

قومیں اپنی غلطیوں سے سیکھ کر حیات تازہ کا آغاز کرتی ہیں۔ مگر یہاں ایسا نہ ہو سکا۔ بادشاہت کے استبداد کی نفسیات کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ کوفہ، بغداد اور قرطبہ کو دلی اور ڈھاکہ سے مشابہہ قرار دینا محض دربدری اور بربادی کی بنا پر نہیں بلکہ تاریخ کے سبق ازبر رکھنے کی خواہش بھی ہے۔ جو مقتدرہ کی پالیسی بن چکے ہیں۔ ہر تخریب کو تعمیر قرار دینا اور ہر ذلت کو عزت سمجھنا طاغوت کی تاریخ ہے۔ یہ طاقتیں مقتدرہ کی حیثیت میں ہوتی ہیں تو عوام مقہور ہوتے ہیں۔ اور جب یہ زوال آمادہ ہو جائیں تو رعایا بھی ساتھ غرق ہو جاتی ہے۔ یہ طاقتیں جزوقتی اقدامات سے حالات پر کنٹرول حاصل کر کے یہ باور کر بیٹھی ہیں کہ معاشرہ ان کی مٹھی میں ہے مگر درحقیقت سماج میں دڑاریں در آتی ہیں اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ یہ سماج ریت کا گھروندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ خود اقتدار تار عنکبوت ثابت ہو کر پورے نظام سمیت زمین بوس ہو جاتا ہے۔ عجب تماشا پھر یہ ہوتا ہے کہ بہن کو برہنہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

کرنے والا ہی تاریخ کا مجرم ٹھہرتا ہے اور مجرم عزتوں کے رکھوالے لکھے جاتے ہیں۔ تاریخ، تہذیب، تصوف اور دیومالا سے کسبِ فیض افسانہ نگار کا مسلک اس لیے رہا ہے کہ ان کی قوم سیاسی، اخلاقی، روحانی اور علمی انحطاط کا شکار ہوئی۔ ناستلجیا سے کوئی احمق فکشن رائٹر ہی ہو گا جو صرفِ نظر کرے گا۔ جب ماضی اور حال میں تفریق ممکن نہ ہو۔ جب اصلاحِ احوال کی بجائے ہر آنے والا روز جہالت اور ہٹ دھرمی میں اضافہ کر رہا ہو۔ معاشرہ انجانے خوف کے عالم میں زندہ ہو، کالک منہ پر مل کر اسے غازہ تصور کیا جائے۔ عزت دار گوشہ نشین ہونے پر مجبور ہوں اور دانشور گنگ ہو جائیں تو ایسے میں اکیسویں صدی اور دورِ جہالت میں خطِ امتیاز کون کھینچے؟ افسانہ نگار نے تخلیق زمیں پر رہ کر کرنی ہے خلا میں نہیں۔ یہ انتظار حسین کا کمالِ فن ہے کہ اتنے تلخ حقائق اور کھردری تاریخ کو بھی انہوں نے اپنے دلکش اسلوب سے آسان بنا کر پیش کیا ہے۔ فتح محمد ملک نے انتظار حسین کی کہانیوں کو نثر میں سہل ممتنع قرار دیا ہے۔(۲۴)

تاریخی واقعات کا بیان فقط یادِ ماضی نہیں ہوتا بلکہ اس میں عصری کرب کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔ کہانی بیک وقت کئی سطحیں لے کر رواں دواں رہتی ہے۔ زیریں سطح تک رسائی کے لیے ژرف نگاہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ انتظار حسین نے موضوعاتی اور اسلوبیاتی ہر دو لحاظ سے افسانے کو نئے تجربات سے متعارف کروایا۔ اپنے زمانے کے آشوب کو انہوں نے کہانی کا مرکزی سروکار بنا کر پیش کیا ہے۔ حقیقت کو تخیل میں مگر گوندھا ایسا ہے کہ اکہری افسانوی تحریریں پڑھنے کے عادی قارئین کے لیے تفہیم مشکل ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار کی اپنی قوم جس ڈگر پر چلی یا چلائی گئی اس سے عقائد اور نظریات کے مباحث نے جنم لیا۔ تشدد، عدم برداشت اور انتہا پسندانہ سوچ جب اس کے نتیجے میں سماج کے اندر آئے تو انہوں نے اپنی روایت سے استفادہ کیا۔ قدیم کہانیوں اور تاریخی واقعات کو حال پر منطبق کرنے کے پیچھے مقصد جو کار فرما نظر آتا ہے وہ تہذیبی معنویت سے آشنائی ہے۔ عصری حوالہ بباطن ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ وہ جیسے خود کہانی میں روپوش ہونے کو ظاہر ہونے پر ترجیح دیتے ہیں۔ یعینہ ان کا افسانہ بھی اپنے مفاہیم کھولنے کی بجائے مخفی رکھتا ہے۔ انتظار شناسوں کی ہندوپاک میں ملا کر کل تعداد ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ افسانہ اور افسانہ نگار ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ انتظار حسین نے روایت سے جو پیوستگی کا ڈول ڈالا اس سے افسانہ کی ہیئت پر کہیں بھی سمجھوتہ (Compromise) نہیں ہوا۔ ان کی ہر کہانی میں جدید افسانہ کے سب لوازمات تزک و احتشام کے ساتھ موجود ہیں۔

## حوالہ جات

(۱) محمد تقی سید۔ ہندوستان پسِ منظر و پیش منظر۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور 2002 ص 19
(۲) ارتضیٰ ایم ڈاکٹر۔ انتظار حسین ایک دبستان۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1996 ص 83
(۳) باری۔ تاریخ کا مطالعہ۔ سٹی بک پوائنٹ، لاہور 2013، ص 33
(۴) گوپی چند نارنگ۔ جدید پریت کے بعد۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2006، ص 228, 229
(۵) صادق علی، ڈاکٹر۔ فنِ تاریخ نویسی۔ ہومر سے ٹائن بی تک۔ ایمپوریم پبلشرز۔ لاہور، طبع دوم، 1998، ص 17
(۶) "گستاولی بان، ڈاکٹر ترجمہ سید علی بگرامی، ص 381 تمدن ہند مقبول اکیڈمی لاہور 1962 ص 381 "
(۷) آصف فرخی۔ چراغ شب افسانہ۔ ص 117
(۸) انتظار حسین۔ آخری آدمی۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور۔ ص 56۔ 2007
(۹) انتظار حسین۔ شہر زاد کے نام۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2002 ص 103
(۱۰) انتظار حسین۔ گلی کوچے۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2007 ص۔ 78
(۱۱) کرین برنٹن، جان بی کرسٹوفر، رابرٹ ایل۔ ولف، ترجمہ غلام رسول مہر۔ تاریخ تہذیب۔ غلام علی سنز، لاہور۔ حصہ اول 1965 ص 13
(۱۲) ارتضیٰ کریم ڈاکٹر۔ انتظار حسین ایک داستان۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ 1996۔ ص 43

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.2 2021

(۱۳) آصف فرخی۔ چراغ شب افسانہ۔ ص137

(۱۴) انتظار حسین۔ علامتوں کا زوال۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2009، ص13

(۱۵) انتظار حسین۔ کنکری۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2007۔ ص29

(۱۶) فتح محمد ملک۔ انتظار حسین کا خواب نامہ۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2016 ص23

(۱۷) انتظار حسین ایک دبستان۔ ص74

(۱۸) انتظار حسین۔ شہر افسوس۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2011۔ ص152

(۱۹) شہر افسوس۔ ص154

(۲۰) انتظار حسین ایک دبستان۔ ص89

(۲۱) انتظار حسین۔ نئی پرانی کہانیاں۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 2011۔ ص17

(۲۲) انتظار حسین کا خواب نامہ۔ ص42

(۲۳) انتظار حسین۔ شہر افسوس۔ ص209

(۲۴) انتظار حسین کا خواب نامہ۔ ص53